

بعثت اور دعوت دین کا آغاز

[”سیر وسوانح“ کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

آغاز وحی

اوپر یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ صحابہ کے زمانہ ہی میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کون سی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ بعض لوگ سورۃ اعلق کی ابتدائی آیات کو پہلی وحی مانتے تھے، لیکن جابر بن عبد اللہ کو اصرار تھا کہ میں نے بطور خاص خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ حضور نے بتایا کہ میں حسب معمول غار حرا میں ایک ماہ مقیم رہا۔ جب یہ مدت ختم ہوئی تو میں پہاڑ سے اتر ا۔ وادی میں مجھے یوں لگا کہ کسی نے مجھے پکارا ہے۔ میں نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مڑ کر دیکھا، لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر ندا آئی تو میں نے سراٹھایا، کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا، ہوا میں ایک تخت پر پورے شکوہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس منظر سے میرے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ چنانچہ میں گھر کو لوٹا اور کہا کہ مجھے چادر اوڑھا دو۔ بعض روایات میں ہے کہ فرشتہ افق سے اترنے لگا اور مجھ سے اتنا قریب ہو گیا جتنا استاد اپنے شاگرد سے قریب ہوتا ہے۔ تب اس نے جھک کر پورے التفات و اہتمام کے ساتھ وحی پہنچائی۔

۱۔ صحیح مسلم۔ باب بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ۸۰/۱۔

ہمارے نزدیک یہ موقع ہے جب حضور کو خلعت رسالت سے نوازا گیا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن نے بھی بڑے اہتمام سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ فرشتہ کو دیکھنا اور اس سے وحی حاصل کرنا ایک ایسا معاملہ تھا جس میں آپ کے واہمہ یا تخیل کو کوئی دخل نہ تھا۔ آپ کی عقل و فہم نے وحی کے پیغام کو سمجھنے میں ذرا بھی غلطی نہیں کی۔ فرشتہ نے اس موقع پر اللہ کا وہ پیغام پہنچایا جو اس موقع پر آپ کو پہنچانا مقصود تھا۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہو گیا۔

رہی یہ بات کہ پہلی وحی کن آیات پر مشتمل تھی تو اس بارے میں متعین طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم اگر حضرت جابر کی روایت پر انحصار کیا جائے تو پہلی وحی یوں تھی:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَأَنْذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ. ”اے چادر اوڑھنے والے، اٹھ اور لوگوں کو خبردار کر۔ اپنے رب کی بڑائی بیان کر، اپنے دامن کو پاک رکھ اور ناپاکی سے دور رہ۔“ (المدثر ۷۴: ۱-۵)

ہمارے نزدیک یہ آیات ایسی ہیں جو وحی کا نقطہ آغاز بن سکتی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ذمہ داری سے گھبرا کر چادر میں لپٹ جانے کے بجائے اٹھ کر لوگوں کا سامنا کرنے، ان کے آگے صرف اللہ کی کبریائی کا چرچا کرنے اور شرک کی نجاست سے دور رہنے کی تلقین ہے۔ ان میں نبی کی اصل ذمہ داری انداز کا واضح ذکر موجود ہے۔ جس کا مطلب ہے لوگوں کو اللہ کی ہدایت کی طرف بلانا اور اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو اس کے برے نتائج سے خبردار کرنا اور ڈرانا۔

پہلی وحی حضور پر ماہ رمضان میں لیلة القدر میں نازل ہوئی۔ یہ بات قرآن مجید کی نص سے ثابت ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے اہم امور کے لیے یہ رات مخصوص کی ہوئی ہے اور نزول قرآن چونکہ انسانیت کی بھلائی کے لیے سب سے اہم پروگرام تھا، اس لیے ہزار ماہ سے بھی زیادہ قیمتی رات لیلة القدر میں اس کا اہتمام فرمایا گیا۔ مزید انتظام یہ کیا گیا کہ جبریل امین کو بارگاہ خداوندی سے رسول اللہ تک وحی پہنچانے میں جو شیطانی قوتیں، خصوصاً جنات، مزاحم ہو سکتی تھیں، ان کی افلاک میں آمد و رفت کو روکنے کے لیے پہرے لگا دیے گئے۔

چونکہ فرشتہ وحی کی پہلی آمد، جو روشناسی کے مقصد سے تھی، اور دوسری آمد میں، جو فی الواقع حضور کی بعثت کی خبر دینے کے لیے تھی، چند ہفتوں کا وقفہ تھا، اس کو فترۃ الوحی سے تعبیر کر لیا گیا اور پھر اس کی مدت تین سال تک پھیلا دی گئی۔ حالانکہ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر رسالت کے کام کو شروع کرانے کے بعد تین سال تک معطل ہی کرنا تھا تو

اس کا آغاز ہی کیوں کیا گیا۔ اس کی کوئی مصلحت تو ہونی چاہیے۔ ہمارے نزدیک حضرت جابر کی روایت مبنی بر حقیقت ہے۔ وحی میں کوئی انقطاع نہیں ہوا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو پہلے دن ہی سے وحی کا آغاز ہو گیا اور آپ اس کی روشنی میں دعوت دین دینے لگے۔

کیفیت وحی

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی نازل ہونے سے پہلے آپ گھنٹی کی آواز سنتے یا آپ کو کھینچنے کی جھنجھٹاہٹ سے ملتی جلتی آواز سنائی دیتی۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تو انھی آوازوں سے الفاظ وحی کی تراوش ہوتی۔ اس کیفیت میں آپ کا جسم پسینہ سے شرابور ہو جاتا اور اعضا پر کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوتی تو آپ کے ذہن میں وحی کے الفاظ محفوظ ہو چکے ہوتے تھے۔^۳

نبی کے جسم پر طاری ہونے والی یہ کیفیات دیکھنے والوں کو نظر آتیں، لیکن نبی کے باطن میں کیا ہو رہا ہوتا، اس کو جاننے کا کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل امین کے درمیان کا معاملہ ہوتا۔ گھنٹی کی آواز یا جھنجھٹاہٹ بھی صرف حضور ہی سنتے۔ آپ کے ساتھی اس سے بے خبر ہوتے۔ ہو سکتا ہے یہ آواز آپ کو متوجہ کرنے کے لیے آتی ہو اور اس وقت تک جاری رہتی ہو، جب تک پیغام وحی مکمل نہ ہو جاتا ہو۔ جہاں تک جسمانی تغیرات کا تعلق ہے یہ اس لیے واقع ہوتے کہ رسول اللہ کا رابطہ عالم ناسوت سے نکل کر عالم لاہوت میں فرشتہ کے ساتھ ہوتا۔ آپ کو اس میں غیر معمولی مشقت پیش آتی۔ اس کیفیت کو بدطینت مستشرقین نے العیاذ باللہ مرگی کے دورہ کا نام دیا ہے، جبکہ مرگی کا مریض دورہ پڑنے پر بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے اور اس کے لیے دورہ کی کیفیت سے نکلنے کے بعد ڈھنگ سے باتیں کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ پیغمبر وحی اترنے کی حالت میں بے ہوش نہیں ہوتے تھے۔ اس کیفیت سے نکلنے کے بعد زندگی بخش معجز کلام آپ کی زبان سے ادا ہوتا اور آپ فوراً اس کی رہنمائی میں ساتھیوں کو نئی ہدایات دیتے اور پیش آمدہ مسائل کو حل فرماتے۔ وحی آپ کے لیے قوت اور تسکین کا باعث بنتی اور آپ کو اپنے کام کے لیے ولولہ تازہ مہیا کرتی۔ وحی شدہ کلام آپ اپنے دوست و دشمن، حلیف و حریف سب کو گوش گزار کرنے پر مامور تھے۔ اس لیے آپ کوئی وحی نازل ہونے کا ہمیشہ انتظار رہتا۔

۳ صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی۔

دعوت کا آغاز

جب کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے تو وہ اس قوم کو مخاطب کر کے اللہ کا یہ پیغام دیتا ہے کہ لوگ اپنے غلط عقیدہ و عمل کو چھوڑ کر اللہ کے بندے بن جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگوں کی فطری نیکی کو ابھارتا، غلط کاموں پر متنبہ کرتا، نصیحت و موعظت کے ذریعے سے ان کو خدا کی بتائی ہوئی راہ راست کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا اور قوم کی فکری و عملی رہنمائی کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی کام خفیہ کرنے کا نہیں ہوتا۔ رسول کی ذمہ داری کی نوعیت سازش کر کے انقلاب برپا کرنے کی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جدوجہد کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھے اور اپنی جماعت کھڑی کر کے ایسے افراد مہیا کرے جو قوم کے اندر رائج نظام کو تلیپٹ کر کے اس کے تجویز کردہ نظام کو نافذ کر دیں۔ رسول کے کام کی نوعیت ہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ اس بات کا آرزو مند ہو کہ ساری قوم اس کی آواز پر لبیک کہہ دے، لیکن عملاً اس کو اس بات کی زیادہ پروا نہیں ہوتی کہ اس کا ساتھ دینے والے کون اور کس حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ کل کتنے تھے اور آج ان کی تعداد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض رسولوں پر ایمان لانے والے چند ہی افراد ہوئے، باقی ساری قوم نے ان کا انکار کیا، تاہم رسول اپنا فریضہ ادا کرنے میں کامران ہوئے۔

رسول دین کی دعوت اپنی کسی غرض کو پورا کرنے کے لیے نہیں دے رہا ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری مالک ارض و سما اس کے سپرد کرتا ہے۔ جو اس کو کام کرنے کا پلان بھی عطا کرتا ہے۔ پیغمبر اسی پلان کی حدود میں رہ کر کام کرتا ہے اور جب اس کا قدم ان حدود سے باہر جانے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ رہنمائی کرتا اور اس کو واپس پلان کی حدود میں لے آتا ہے۔ چونکہ پیغمبر کا کام جان جو حکم میں ڈالنے کا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا ہے۔ ہر مشکل وقت میں وہی اس کی دست گیری فرماتا ہے۔ لہذا رسول کو کسی بھی مرحلہ پر اپنی قوم کے کسی سخت رد عمل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دعوت کو خفیہ رکھنے پر مجبور ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر میں تھے تو ان کے ہاتھوں ایک قبیلے کے قتل کا واقعہ پیش آ گیا جس میں ان کے ارادہ کو کوئی دخل نہ تھا۔ چونکہ فرعون کو بنی اسرائیل سے بیر تھا، اس لیے موسیٰ علیہ السلام کو اس قتل کا ذمہ دار گردانا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب رسالت سے سرفراز فرمایا تو ساتھ ہی ان کو حکم ہوا کہ فرعون کے دربار میں جا کر میرا پیغام پہنچاؤ، وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے کوئی خفیہ منصوبہ تیار نہیں کیا، بلکہ بے دھڑک فرعون کے پاس چلے گئے۔ فرعون نے ان کے پچھلے جرم کا حوالہ دیا اور یہ امکان بھی تھا کہ وہ ان کو گرفتار کر لے، مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد تھا:

لَا تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمْ آسَمِعُ وَآرَى. ”تم دونوں (یعنی موسیٰ و ہارون علیہما السلام) اندیشہ

(طہ ۲۰:۴۶) مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا

ہوں۔“

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم المرتبت خاتم الانبیاء کے بارے میں آپ کے سیرت نگاروں نے یہ تاثر کیسے پھیلا دیا، اور امت نے اس کو قبول کیسے کر لیا کہ بعثت کے بعد تین سالوں تک آپ نے خفیہ تبلیغ کی۔ یہ بات رسولوں کی سنت سے مطابقت نہیں رکھتی اور حقائق کے بھی منافی ہے۔ اگر آپ نے قریش کی مخالفت کے خوف سے ایسا کیا تو کیا اللہ تعالیٰ کی وہ حفاظت آپ کو حاصل نہ تھی جو تمام رسولوں کو حاصل رہی ہے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ تین سالوں کے بعد جب آپ نے علانیہ تبلیغ شروع کی تو کیا اس وقت قریش کی عداوت ختم ہو چکی تھی؟ یا کیا اس عرصہ کے دوران میں آپ نے چوری چھپے اتنی نفری مہیا کر لی تھی کہ آپ قریش کے مد مقابل بن کر آ سکتے؟ تاریخ گواہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عرصہ میں دعوت کو لوگوں کے علم میں لانے میں رکاوٹ پیدا کی تو یہ اللہ تعالیٰ کی ڈالی ہوئی ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہی تھی جو حضور کی عظمت و شان کے منافی ہے۔ خفیہ تبلیغ کی کوئی اور حکمت سیرت نگار بیان نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک آپ کی جدوجہد کا کوئی دور خفیہ نہیں رہا۔ آپ نے دعوت دین کا کام ٹھیک اس پلان کے مطابق کیا جو آپ کو اللہ رب العزت کی طرف سے دیا گیا تھا اور اس میں ایک تدریجی ملحوظ رکھنے کا حکم تھا۔ فرمایا گیا:

وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ وَخَفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ. ”اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ اور جن اہل ایمان نے تمہاری پیروی کی ہے، ان کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو، اگر یہ لوگ تمہاری نافرمانی کریں تو ان کو سنا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، میں اس سے بری ہوں اور خداے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھو۔“

(الشعراء ۲۶:۲۱۴-۲۱۷)

اس پلان کے مطابق دعوت دین کا آغاز آپ نے اپنے قریبی خاندان یعنی قریش سے کرنا تھا، جو لوگ دعوت قبول کرتے، ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنا اور ان کو کفار کے زرعے سے نکالنا تھا۔ بعد کے مرحلہ میں دعوت کو پورے زور و قوت کے ساتھ بلند آہنگ ہو کر پیش کرنا اور شرک پر جسے ہوئے ان لوگوں سے، جو آپ کی بات نہ سنیں، اعلان برأت کرنا تھا۔ اس پورے کام میں ہدایت یہ تھی کہ آپ محض اللہ پر بھروسہ کریں جو زبردست اور اپنے

ارادوں کو بروئے کار لانے پر قادر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کا آغاز بالکل فطری انداز میں الاقرب فالاقرب کے اصول پر کیا۔ یعنی اپنے قریب ترین لوگوں سے آغاز کر کے آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو پہلوں کے بعد قریب ترین تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنی نئی ذمہ داری سے اپنی اہلیہ محترمہ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آگاہ کیا جو پہلے ہی سے آپ کے عقیدہ و عمل کی مداح اور آپ کی رسالت کی خبر کی منتظر تھیں، انھوں نے فی الفور آپ کی دعوت قبول کی۔ اس کے بعد یہ بات آپ کے باقی اہل خانہ کے علم میں آئی۔ ان میں سے آپ کی بیٹیوں زینب اور رقیہ اور آزاد کردہ غلام و متنبی زید بن حارثہ نے اسلام قبول کیا۔ حضور کی تیسری اور چوتھی صاحب زادیاں ام کلثوم اور فاطمہ ابھی کم سن تھیں۔ قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق تو حضرت فاطمہ کی ابھی ولادت نہیں ہوئی تھی اور حضرت علی، جو آں حضرت کی تولیت میں تھے، صرف آٹھ سال کے تھے اور ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے۔ بہر حال یہ صاحب زادیاں اور حضرت علی اسلام ہی کی آغوش میں پلے بڑھے اور سن شعور کو پہنچ کر انھوں نے اسلام ہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔

گھر سے باہر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں، قدردانوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ آپ نے ان پر توجہ دی۔ جوں جوں وہ اسلام کی تعلیم کے قائل ہوتے گئے، نہ صرف خود حلقہ بگوش اسلام ہوئے، بلکہ اپنے اپنے اہل خانہ یا دوستوں کو بھی اس دین میں لانے کا ذریعہ بنے۔ ان کا تعلق قریش کے بھی خاندانوں سے تھا۔ اس کا اندازہ سابقون الاولون (یعنی شروع ہی میں ایمان لانے والوں) کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے جو سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے۔ ہم قریش کے خاندانوں کے حوالہ سے اسے یہاں نقل کرتے ہیں:

بنو ہاشم: جعفر بن ابی طالب مع زوجہ اسماء بنت عمیس

بنو مطلب: عبیدہ بن الحارث

بنو عبد شمس: عثمان بن عفان

خالد بن سعید بن العاص

سلیط بن عمرو

ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ

بنو اسد: زبیر بن العوام

۴ سلیمان منصور پوری۔ رحمۃ للعالمین۔ ۱۲۳، ۸۱۔

خدیجہ بنت خویلد	زوجہ رسول اللہ
بنو مخزوم:	ابو سلمہ بن عبد الاسد
عیاش بن ابی ربیعہ	مع زوجہ اسماء بنت سلامہ
ارقم بن عبد مناف	
بنو تیم:	عبد اللہ بن ابی قحافہ (حضرت ابو بکر)
طلحہ بن عبید اللہ	
اسماء بنت ابی بکر	(حضرت عائشہ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچی تھیں)
بنو زہرہ:	عبد الرحمن بن عوف
سعد بن ابی وقاص	وعمر بن ابی وقاص
خباب بن الارت	(حلیف)
عبد اللہ بن مسعود	(حلیف)
بنو عدی:	سعید بن زید
بنو جح:	عثمان بن مظعون و قدامہ بن مظعون و عبد اللہ بن مظعون
بنو سہم:	حنیس بن حذافہ
بنو اسد بن خزیمہ:	عبد اللہ بن جحش و ابو احمد بن جحش و زینب بنت جحش
بنو حارث:	ابو عبیدہ بن الجراح

ان کے علاوہ غلاموں میں عمار بن یاسر، یاسر مع زوجہ سمیہ، عامر بن فہیرہ اور صہیب بن سنان کے نام قدیم الاسلام صحابہ کے طور پر آتے ہیں۔ سیرت کی قدیم ترین کتابوں کے مطابق نبوت کے پانچویں سال تک مسلمانوں کی تعداد سو اسو سے زیادہ ہو چکی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ابتدا ہی میں قریش کے تمام خاندانوں کے اچھے افراد کو متاثر کر کے ان کے دلوں کو جیت لینے والی دعوت کیا خفیہ تھی اور اتنے لوگوں کا اسلام کیا مخفی رہ سکتا تھا کہ قریش کی لیڈر شپ کو تین سالوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ وہ اس آنے والے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوئی تدبیر کر سکتے۔

دوسرے زاویہ سے دیکھیں تو قریش کے خانوادے کوئی الگ الگ جزیرے نہ تھے کہ بنو ہاشم میں پیش آنے والا

ایک واقعہ بنو امیہ یا بنو اسد یا بنو مخزوم کے علم میں نہ آ سکتا۔ ان کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ آں حضرت کی پھوپھی ام الحکیم بیضاء بنو امیہ میں، پھوپھی صفیہ بنو اسد میں، پھوپھی برہ بنو مخزوم میں اور پھوپھی امیمہ بنو اسد بن خزیمہ میں بیاہی ہوئی تھیں۔ عثمان بن عفان بیضاء کے نواسے اور زبیر بن العوام حضرت خدیجہ کے بھتیجے اور صفیہ کے بیٹے تھے۔ جحش کے صاحب زادے امیمہ کی اولاد اور ابو سلمہ برہ کے بیٹے تھے۔ بنو ہرہ آں حضرت کے ننھیال اور بنو اسد آپ کے سسرال تھے۔ اتنی قریبی رشتہ داریوں میں باہمی تعلقات بے تکلف ہوتے ہیں، تمام لوگ ایک دوسرے کے احوال سے باخبر ہوتے ہیں اور کوئی بھی غیر معمولی واقعہ خفیہ نہیں رہ سکتا۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہی تین سال تک کیسے خفیہ رہ گئی!

دعوت کو برداشت کرنے کا دور

ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ نہ صرف یہ کہ قریش کی لیڈر شپ کی نگاہوں کے سامنے ہو رہی تھی، بلکہ انھی کو مخاطب کیا جا رہا تھا، کیونکہ حضور کے عشیرہ و قبیلہ وہی تھے۔ لوگوں کے قبول اسلام کی رفتار بالکل فطری تھی۔ لوگ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے، آپ کا نقطہ نظر معلوم کرتے اور جیسے جیسے دعوت کے معاملہ میں یک سوہوتے قبول اسلام کی راہ میں کوئی چیز سد راہ نہیں بنتی تھی۔ آغاز کار میں بوجہ قریش کے لیڈروں نے حضور کی مخالفت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا، بلکہ دعوت کو حید کو برداشت کیا۔ اس لیے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ آں حضرت کی دعوت کا خفیہ دور تھا۔ قریش کے اس رویہ کے بظاہر تین اسباب سمجھ میں آتے ہیں:

اولاً: اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنے رسول پر ایک تدریج کے ساتھ نازل ہوا۔ ابتدا میں اس کا ہدف دلوں کے اندر نیکی کے فطری داعیہ کو ابھارنا اور معاشرتی برائیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا تھا۔ اس میں خدا سے شکر گزاری کے تعلق، بندوں کے حقوق کے شعور، غربا پروری، مسکینوں کی دست گیری، یتیموں پر شفقت اور مکارم اخلاق کو تعلیم کا مرکزی نقطہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کچھ آیات ملاحظہ ہوں:

کَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ. وَلَا تَحْضُونَ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ. وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا. وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا. (الفجر ۸۹: ۱۷-۲۰)

”ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے، مسکینوں کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے، وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔“

”کیا ہم نے (انسان) کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور
ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے، اور اس کو دونوں
راہیں نہیں سجھادیں؟ پر اس نے گھائی نہیں پار کی۔ اور تم
کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھائی! گردن کو چھڑانا یا بھوک
کے زمانہ میں کسی قرابت دار یتیم یا کسی خاک آلود مسکین
کو کھلانا۔ پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور
جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت
کی۔“

”تمہاری سرگرمی کے ثمرات الگ الگ ہیں۔ سو جس
نے انفاق کیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے انجام کو
پہنچا، اس کو تو ہم اہل بنائیں گے راحت کی منزل کا
اور جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا اور اچھے انجام کو
پہنچایا، اس کو ہم ڈھیل دیں گے کٹھن منزل کے لیے۔“
(اللیل ۹۲: ۴۰-۹۰)

تمام اچھے اہل عرب ان اعلیٰ مقاصد کے ہمیشہ سے خوگر تھے جن کی تعلیم قرآن دے رہا تھا۔ اس تعلیم سے
شرافے قریش کے دلوں میں کوئی کھٹک نہیں پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس دعوت کو ایک مقبول و ہر دلعزیز مصلح کی ایک
قابل قدر سرگرمی قرار دیا۔

ثانیاً: قریش کے اندر دین حنیف کے ماننے والوں کی ایک روایت پہلے سے موجود تھی۔ ان لوگوں کی تعداد اگرچہ
زیادہ نہ رہی ہو، لیکن یہ لوگ عین خانہ کعبہ کے سایہ میں اپنے عقائد کا برملا اظہار کرتے اور معاشرہ ان لوگوں کو برداشت
کرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حنیف تو تھے ہی، آپ معاشرے کے سب سے زیادہ باکردار، مکارم اخلاق کا پیکر،
حسن عمل کا نمونہ، مجسم صداقت و امانت اور حق نصیحت ادا کرنے والے بھی تھے۔ قوم آپ کی قدردان اور آپ پر اعتماد
کرتی تھی۔ آپ نے دین کی دعوت دینا شروع کی تو وہ آپ کے اسی کردار کو مزید نمایاں کرنے والی تھی۔ لہذا قریش کو
ابتدا میں اس دعوت سے کوئی وحشت نہیں ہوئی۔ یہ اسی طرح کی صورت حال تھی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے
والد اور قوم کو بتوں کی پوجا سے منع کرتے رہے تو قوم ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے بتوں کو
توڑ ڈالا اور بتوں کے پجاریوں نے قیاس آرائی شروع کی کہ یہ کارروائی کس شخص کی ہو سکتی ہے تو انہوں نے یقین

کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا نام نہیں لیا، بلکہ محض گمان کا اظہار کرتے ہوئے کہا:
 سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ اِبْرَاهِيْمٌ. ”ایک نوجوان کو، جس کا نام ابراہیم ہے، ہم نے ان
 (الانبیاء: ۶۰) بتوں کا (برا) ذکر کرتے سنا ہے۔“

یعنی یہ شخص چونکہ بتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مخالفانہ انداز میں کرتا رہا ہے، لہذا ممکن ہے اسی نے
 یہ حرکت کی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جب وہ تقاضے سامنے آئے جن کی زد قریش کے مفادات پر
 پڑتی تھی اور انھیں اپنے مذہبی نظام میں دراڑیں پڑنے کا خطرہ محسوس ہوا تب انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ
 کی دعوت کے معاملہ میں رویہ تبدیل کیا۔

ثالثاً: عربوں کی زندگی قبائلی تھی۔ ہر خاندان اپنے افراد کا ہی خواہ اور محافظ ہوتا تھا۔ دوسرے قبائل اور خاندانوں
 کے لوگ کسی غیر خاندان کے فرد کو نقصان پہنچانے سے پہلے سو بار سوچتے تھے کہ اس فرد کے خاندان کے جذبہ انتقام کو
 کیسے ٹھنڈا کریں گے اور ان کے نقصان کی تلافی کی کیا صورت ہوگی۔ قریش کے اندر جب اسلام قبول کرنے والوں
 پر تشدد کرنے اور دعوت دین کو زور و قوت سے کچل دینے کا خیال پیدا ہوا تو بار بار یہی سوال سامنے آتا رہا کہ متاثرین
 کے خاندانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت بھی کسی میں ہے یا نہیں۔ عرب قبائل میں اپنے افراد کا ساتھ دینے اور ان کے
 ساتھ زیادتی کا انتقام لینے کی روایت اس قدر مستحکم تھی کہ بعد میں جب یثرب کے قبائل اوس اور خزرج نے اسلام
 قبول کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں لے جانے کی پیشکش کی تو اس سے پہلے آپ سے یہ یقین دہانی
 حاصل کی کہ ان قبائل کے ان افراد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا جو یہودیت اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضور نے
 ان یہودیوں کے وہی حقوق تسلیم کیے جو اسلام لانے والوں کے تسلیم کیے۔

قریش کو انداز کا حکم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کو برداشت کرنے کا یہ دور عارضی تھا۔ جلد ہی بیت اللہ کے متولیوں پر قرآن
 میں تنقید ہونے لگی اور ان کی کوتاہیوں کا پردہ چاک ہونے لگا تو ان کا رویہ بھی بدل گیا۔ انھوں نے رسول اللہ کی برملا
 مخالفت شروع کر دی اور دعوت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ملی کہ
 اپنے قرابت مند خاندان کو انداز کرو۔ انداز کا مطلب یہ تھا کہ ان کو خبردار کرو کہ وہ اپنی حرکتوں کو چھوڑ کر اسلام کی تعلیم
 کو قبول کریں ورنہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ کے لیے تیار رہیں، جس سے چھڑانے والا اور اللہ کے عذاب سے پناہ دینے والا

کوئی نہ ہوگا۔ قرابت مند خاندان سے مراد بنو ہاشم ہی نہیں، بلکہ وہ تمام خاندان بھی تھے جن کا تعلق خانہ کعبہ کے نظم و نسق، اس کی حفاظت و خدمت اور مذہبی رسوم ادا کرانے سے تھا یعنی قریش کے تمام خانوادے۔ انداز کی ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ اللہ کے گھر کے یہ متولی اور ناظمین اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی اصلاح کر کے دوسرے عربوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کھولیں، کیونکہ دین کے معاملہ میں یہ ان کے مذہبی پیشوا ہیں۔ اگر یہ طبقہ کسی طرح دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے تو دوسرے لوگ بہ آسانی ان کی پیروی میں دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور جب تک یہ طبقہ دعوت کو قبول نہ کرے تو یہ عوام الناس کو اپنے مشوروں اور نصیحتوں کے ذریعے سے دعوت کی مخالفت اور بیخ کنی پر اکساتا رہتا ہے۔

یاد رہے کہ حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ اللہ واحد کی عبادت کے مرکز کے طور پر بنایا تھا اور اپنی اولاد کو اس میں نماز، طواف، اعتکاف، حج اور قربانی کی سہولتیں مہیا کرنے اور زائرین کی خدمت کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔ لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اولاد ابراہیم بیت اللہ کے اندر شرک کو تحفظ دینے اور توحید کی آواز دبانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ لوگ حضور کی دعوت کو قبول کر لیتے تو بیت اللہ کے نظام کو اس کی اصل شکل میں قائم کرنا ممکن ہوتا جس کی آرزو ابراہیم نے کی تھی اور جس کے لیے درد دل کے ساتھ دعا مانگی کی تھیں۔

قرآن کی مذکورہ ہدایت پر عمل کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہر ممکن طریقہ اختیار فرمایا وہیں عربوں میں مروج طریقہ بھی اپنایا۔ ان کے ہاں یہ روایت تھی کہ اپنے دشمنوں کی غارت گری سے محفوظ رہنے کے لیے وہ اپنی بستی کے قریب کبھی ٹیلہ پر ایک دیدبان مقرر کر دیتے جو چاروں طرف نگاہ رکھتا۔ اگر دیدبان کبھی خطرہ محسوس کرتا تو 'یا صبا حاہ' کا نعرہ بلند کرتا جس کا مطلب ہوتا کہ غارت گری کا خطرہ ہے۔ لوگ آواز سنتے ہی گھروں سے نکل کر بھاگتے ہوئے اس کے پاس آتے اور خطرہ کی نوعیت پوچھتے۔ اگر حملہ ہونے والا ہوتا تو وہ اپنے ہتھیار لگا کر میدان میں آ جاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک صبح کوہ صفا پر کھڑے ہو کر یہی نعرہ لگایا تو لوگوں نے حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھا کہ یہ نعرہ کون لگا رہا ہے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے تو قریش کے عام و خاص صفا کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں ایک نذیر (یعنی خطرہ سے خبردار کرنے والا) ہوں۔ میری اور تم لوگوں کی مثال اس آدمی کی ہے جو دشمن پر نظر رکھنے کے لیے اپنے قبیلہ کی دیدبانی کرتا ہے۔ پھر جب ڈرتا ہے کہ دشمن کہیں ان تک پہنچ نہ جائے تو 'یا صبا حاہ' کا نعرہ بلند کر دیتا ہے۔ میں ایک آنے والے سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ اے بنو کعب بن لوی، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو مرہ بن کعب،

اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد شمس، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد مناف، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد المطلب، اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ میں اللہ کے ہاں تمہارے لیے کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ البتہ تمہارے ساتھ میرا رجمی رشتہ ہے، سو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ اس موقع پر واحد آواز جو آپ کے خلاف اٹھی، وہ ابولہب کی تھی جس نے کہا: 'تَبَّ لَكَ اَلِهٰذَا دَعَوَتَنَا' (غارت ہو، کیا اسی لیے تم نے ہمیں بلایا تھا؟)۔

دوبارہ آپ نے انداز کی ہدایت پر عمل کرنے کی یہ تدبیر اختیار کی کہ تمام قرابت داروں کو کھانے پر بلایا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے ان سے خطاب کر کے اپنی دعوت پیش کرنا چاہی، لیکن ابولہب آپ کی تقریر میں مغل ہو گیا اور لوگوں سے کہا کہ اب یہ شخص تم پر اپنا جادو چلانا چاہتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی منتشر ہو گئے۔ اس طرح حضور کو دعوت پیش کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برملا انداز کے مضمون کو عوام میں بیان کرنا شروع کر دیا جس سے قرشی لیڈر چپیں بجیں ہوئے۔

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ”حیات رسول امی“ سے انتخاب)